© rasailojaraid.com

مذہب کا تقابلی مطالعہ - کیوں اور کس طرح

از

ولفرڈ کینٹول اسمتھ - صدر شعبہ دراسات اسلامیہ - جامعہ میک گل مانٹریال (کینیڈا)

مترجمہ

جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت و جناب ڈاکٹر ابو نصر محمد صاحب خالدی

(۲)

پچھلے سو سال کی مدت میں مشرقی مذہبوں پر مغربی تحریروں نے قابلِ لحاظ اثر ڈالا ہے۔ یہ اثر مغربی تحریروں کے ٹھوس مواد کا رہینِ منت ہے۔ یہ اثر خود ان مذاہب کی ترقی پر بھی پڑا ہے۔ ضرورت ہے کہ تاریخی حیثیت سے اس اثر پر احتیاط کے ساتھ تحقیق کی جائے۔ علاوہ بریں بہ حیثیت مجموعی یہ تحریریں بڑی حد تک اس پیرایۂ بیان سے جس میں یہ پیش ہوتی ہیں، بیزاری کا سبب بن رہی ہیں اور صدائے احتجاج بھی بلند کروا رہی ہیں[۱]۔ بے شبہ ایسے حضرات جن کے نزدیک مذہب کا تقابلی مطالعہ مختلف مذہبی برادریوں کے

---

[۱] ایسی بہت سی مثالوں میں سے ایک مثال جماعت اسلامی کے لئے خورشید احمد کا لکھا ہوا کتابچہ "اسلام اور مغرب" (لاہور، تاریخ ندارد، غالباً ۱۹۵۸ء) ہے [اگرچہ یہ کتابچہ بظاہر مغرب کو مخاطب کر کے لکھا گیا ہے (اور اس کا مستحق ہے کہ بہ امعانِ نظر اس کا مطالعہ کیا جائے) لیکن حقیقت میں اس کے مخاطب مغربی روش اختیار کرنے والے نوجوان مسلمان ہیں بمصنف کے خیال کے مطابق یہ وہ نوجوان ہیں جنہیں اسلام سے متعلق مغربی تحریروں سے متاثر ہونے کا خطرہ لگا ہوا ہے] "دی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" ایک لحاظ سے یورپی علمیت کا ایک شاندار کارنامہ ہے۔ پہلی مرتبہ یہ کتاب لیڈن اور لندن سے ایک ساتھ (۱۹۰۸-۱۹۳۸ء) شائع ہوتی رہی، نظرثانی کے بعد اب یہ کتاب دوبارہ شائع کی جارہی ہے اس کتاب سے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی کھلی بے اطمینانی کو بھی ایک حد تک اسی (باقی بر صفحہ آئندہ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درمیان بھائی چارگی اور خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کا ذریعہ ہو سکتا ہے یا ہونا چاہیئے، اس کے برعکس اثر کو دیکھ کر اس سے بے تعلق نہیں رہ سکتے۔ بعض حضرات اسے ایک اخلاقی نکتہ سمجھتے ہیں اگرچہ یہ اخلاقی نکتہ لازماً عقلی اصولوں سے ذیل میں نہیں آتا۔ بہرحال ایسے لوگوں کو یہ بات تسلیم کر لینی چاہیئے کہ اس وقت صورتِ حال ایسی ہے کہ آج جو شخص بھی اپنے مذہب کے سوا مذاہب پر کچھ لکھے تو اس طرح لکھے کہ ان مذاہب کے پیرو بھی فی الواقع سامنے موجود ہیں۔

ہم برابر اس بات پر زور دیتے آرہے ہیں کہ مذہب انسانوں کی زندگی میں شخصی حیثیت رکھتا ہے اور کچھ نہیں تو یہ کیا کم ہے کہ اگر کوئی مصنف ہماری اس بات پر پوری طرح توجہ نہیں کرتا تب بھی اس کی تحریر کے متعلق خود ان لوگوں کے بڑھتے ہوئے اہم ردِّ عمل کی وجہ سے (جن کے بارے میں وہ لکھ رہا ہے) اس کو اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنی پڑ رہی ہے۔

اب یہ بات وسیع پیمانے پر تسلیم کی جارہی ہے کہ مذہب کا تقابلی مطالعہ کرنے والا جو کچھ کہے یہ پیش نظر رکھ کر کہے کہ جن لوگوں کے بارے میں وہ کہہ رہا ہے وہ بھی اس کی بات سن رہے ہیں۔ اس اصول کا اثر کم از کم اس بات پر تو ضرور پڑے گا کہ کوئی چیز کس طرح پیش کی جارہی ہے اور جو کچھ کہا جارہا ہے شاید اس کی نوعیت بھی اس سے ضرور متاثر ہوگی۔ صاف سیدھی بات یہ ہے کہ مصنف کو نہ صرف زیادہ خوش اخلاقی سے بلکہ زیادہ ذمہ داری کے ساتھ لکھنا چاہیئے۔

حاشیہ متعلق صفحۂ گذشتہ۔ عنوان کے تحت لایا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بے اطمینانی ایک ایسی ملّت کے احساسِ بیزاری کی نشاندہی کرتی ہے جسے اس بات کا ابتدائی اور دھندلا سا احساس ہے کہ اس کے معاملات پر گفتگو میں خود اسی کو گفتگو میں لینے سے محروم رکھا گیا ہے اس سلسلہ میں جو احتجاج ہوئے اُن کی وجہ سے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مدیروں نے پہلی مرتبہ مذکورہ حقیقت کا احساس کرتے ہوئے یہ بات تسلیم کی کہ حقیقت میں یہ انسائیکلو پیڈیا عام قاریوں کے لئے نہیں بلکہ خاص طور پر مغربی یورپ کی عالمانہ روایت کے مطابق اہل مغرب کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس کے لکھنے والے بھی مغرب کے علما رہے تھے اس صورتِ حال پر میں نے اپنے مقالے کے دوسرے حصہ کے ذیل میں بحث کی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مجھے تو اصرار اس پر ہے کہ ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہو رہی ہے بلکہ ایسی صورت کو بالقصد و ارادہ اور تیزی کے ساتھ ظہور پذیر ہونا چاہیئے ۔ میں اسی کو اپنے دوسرے قضیے کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتا ہوں میرا دوسرا قضیہ یہ ہے : کسی مذہب کے بارے میں کوئی بیان اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کہ خود اُس مذہب کے ماننے والے بھی اس بیان کی صحت کو تسلیم نہ کریں ۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ایک انقلابی دعویٰ ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اسے آسانی کے ساتھ قبول نہیں کیا جائے گا لیکن میرا ایقان ہے کہ یہ غایت درجہ درست اور اہم ہے ۔ اس کی تفصیلی تائید کے لئے اس مقالے میں جتنی گنجائش قابل حصول ہے اس سے زیادہ جگہ درکار ہوگی ۔ کیونکہ میں خود محسوس کرتا ہوں کہ اس کے سمجھنے میں غلط فہمیاں کئی طرح سے پیدا ہو سکتی ہیں اور اس کے خلاف بہت سے اعتراض پیش کئے جا سکتے ہیں جن کا جواب تفصیل ہی میں دیا جا سکتا ہے ۔ میں پھر اتنا یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جیسا کہ میں عرض کر آیا ہوں " مذہب " سے میری مراد وہ ایمان ہے جو لوگوں کے قلوب میں ہوتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ مذہب کے خارجی معلومات پر محنت کے ساتھ تحقیق کر کے کوئی غیر شخص ایسی باتیں دریافت کر سکتا ہے جس سے اس مذہب کا پیرو ناواقف ہو یا اُن کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہو لیکن اس دین میں اس نظام کی کیا معنویت ہے اس کو سمجھنے میں صورت حال ہی ایسی ہے کہ غیر شخص قدرتاً اس مذہب کے پیرو سے کسی طرح آگے نہیں جا سکتا ۔ کیونکہ اس مذہب کے ماننے والوں کا تقویٰ اور ان کا احسان ہی ایمان ہے اور اگر وہ غیر کی کھینچی ہوئی تصویر کو اپنے دین کی تصویر تسلیم نہ کریں تو یہ اُن کے دین کی تصویر نہ ہوگی تاریخی تغیرات کے لحاظ سے پیچیدگیاں موجود ہیں ۔ میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ مذہب ترقی کرتا رہتا ہے یعنی تدریجاً بالقوہ سے بالفعل ہوتا ہے اگرچہ مذہب کے کم ہی پیرو اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں[1] ۔ چنانچہ مذہب کے تعلق سے جو بات کبھی درست تھی ہو سکتا ہے کہ آگے درست نہ رہ سکے اور اس مذہب کا پیرو صرف حال کے بارے ہی میں کچھ کہنے کا حق رکھتا ہے[2] علاوہ ازیں کچھ اور بھی پیچیدگیاں

---

[1] ارتقاء مذہب کے تصور کے بارے میں جو دشواریاں اور پیچیدگیاں ہیں اُن میں سے بعض پیچیدگیوں کا مطالعہ میں نے اپنے اس افتتاحی خطبے میں پیش کیا ہے جس کا ذکر حاشیہ نشان (۵) میں آچکا ہے

[2] اور استناد کا آخری درجہ وہ صرف اپنے لئے رکھتا ہے ۔ کسی فرد کے ایمان اور اس کی ملت کے ایمان کا رشتہ ایک نازک مسئلہ ہے میں اس مسئلہ کا جائزہ " مذہب " کے تصور کی تاریخ پر آئندہ ایک خطباتی سلسلہ میں لوں گا ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ کسی قطعی تشریح و تفسیر سے پہلے ان سب کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے بعض پیچیدگیوں کا جائزہ لیا جا چکا ہے اور بعض کی مزید وضاحت درکار ہے۔ لیکن اس کے بنیادی نکتہ کے بارے میں مجھے کوئی شک ریب نہیں ہے۔ مجھے بشدت اس بات پر اصرار ہے کہ ثمر آور مطالعہ کے لئے اس اصول کا تسلیم کرنا ضروری ہے۔ بے شُبہ یہ کوئی تحدید نہیں بلکہ ایک تعمیری اصول ہے۔ یہ اصول ایسا تجرباتی معیار مقابلہ مہیا کرتا ہے جو طالب علم کو اس قوت محرکہ کے ذریعہ حق تک پہونچا دے گا [1]

کوئی غیر نصرانی شخص کلیسا کی تاریخ پر ایک مستند کتاب لکھ سکتا ہے۔ لیکن چاہے وہ کتنا ہی دانا، کتنا ہی عالم متبحر اور کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو، ذہن نصرانیت کیا ہے، اس کے بارے میں وہ نصرانیوں کی تردید و تغلیط نہیں کر سکتا، نصرانیت کیا ہے، اس کو غیر نصرانی بس ایک ہی طرح متعین کر سکتا ہے۔ وہ طریقہ ہے نصرانی افعال، نصرانی فنون یا نصرانی اعمال سے نتائج کا استخراج۔ لیکن کیا اس کے یہ نتائج درست ہیں (اس کا فیصلہ کرنے میں وہ نصرانیوں سے کسی طرح موزوں تر نہیں ہو سکتا۔ یقیناً بعض نصرانی نہایت وثوق سے کہتے ہیں کہ اصولی طور پر کوئی شخص ذہن نصرانیت کو اس وقت تک سمجھ ہی نہیں سکتا۔

[1] مثلاً ہسٹن اسمتھ اپنی کتاب کے مقدمہ میں (اس کتاب کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے ملاحظہ ہو حاشیہ نشان (۱۵) کہتے ہیں کہ انھوں نے مختلف مذاہب کے عالموں کو ان کے مذہب سے متعلق چند ابواب دکھائے۔ اسمتھ کا یہ فعل باعث تعجب انگیز نہیں رہا۔ ان کا یہ فعل میرے اس اصول کی پر زور تائید کرتا ہے جو میں نے ایسی تحریروں کے جائز و مستند ہونے کے سلسلہ میں منضبط کیا ہے۔ علاوہ بریں اُن کا یہ فعل یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ ایسا کرنا کتنا بار آور ہو سکتا ہے۔ دوسری مثال لیجئے ایک تازہ کتاب E. Perry: The Gospel in Dispute (ملاحظہ ہو آگے حاشیہ نشان ۴۴) کے گرد پوش پر اس کے ناشروں (اس کتاب کے ناشر Doubleday ہیں) نے یہ اعلان شائع کیا ہے: "ڈاکٹر پیری نے چار غیر نصرانی مذاہب کی واضح تصویر پیش کرنے کے لئے ثقافتی ماہران علم الاقوام کی مہارت سے استفادہ کیا ہے۔ یہ ان مذاہب کی تصویر ہے جسے ان مذاہب کے پیروؤں نے پر جوش طریقہ پر اپنی ہی تصویر ہونا تسلیم کیا ہے" تجارتی پیش اندازوں کی گنجائش رکھتے ہوئے بھی یہ دعا دلچسپ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناشر اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ کتاب پڑھنے والے کس طرح کی باتوں کو پسند کرتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب تک کہ وہ اس کو قبول نہ کر لے۔ ہم اس درجہ آگے نہیں بڑھتے۔ لیکن اس دعوی میں جو وزن ہے اس کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس اصول کا اطلاق سارے مذاہب پر ہوتا ہے لیکن زندہ مذہب کی حیثیت سے میں اسلام کے تعلق سے جو بات بھی کہوں وہ اسی وقت درست ہوگی جب کہ مسلمان اس پر "آمین" کہہ سکیں۔

اس کے برعکس صورت یقیناً درست نہیں۔ اسلام کے متعلق ہر وہ بیان جو مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو اس کا من وعن درست ہونا ضروری نہیں۔ کوئی غیر مسلم بطور خوشامد کسی مسلم کی تائید کر سکتا ہے، اس کو دھوکہ دے سکتا یا اس کو گمراہ کر سکتا ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کی بھی ضرورت نہیں کہ غیر مسلم مسلمانوں کے ہر قول وفعل کو درست سمجھیں۔ نظری اور عملی دونوں طرح یہ ممکن ہے۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی مذہب کے معنی عصری اصطلاحوں میں متعین کرتے ہوئے کسی دوسرے مذہب کا عالم اس مذہب کے ماننے والے سے زیادہ کامیابی کے ساتھ نئے میدان تلاش کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر عہد حاضر میں خود مسلمان اپنے دین کے بارے میں کوئی ایسی علمی وضاحت پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں جو مغرب کے مخاطبوں کے دلوں میں اسلام کے معنی جاگزیں کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوتی[1] اسلام کے متعلق کوئی غیر مسلم عالم لکھنے بیٹھے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اسلام کی ایسی تشریح وتعبیر پیش کرے جو مغرب کی علمی روایت کے شایان شان ہو۔ اس کے بیان کو راست خارجی شہادتوں پر مبنی ہونا چاہیئے منطقی حیثیت سے اسے خود اپنے دائرہ بحث میں مربوط ومتوازن ہونے کے علاوہ دوسرے علوم سے بھی مربوط ومتوازن ہونا ضروری ہوگا۔ ان

---

[1] یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے اور اس کا اقرار کرنے والے بعض مسلمان بھی ہیں (بجی گفت گو میں) کہ کینتھ گراگ کی کتاب "ندائے مینار" (Kenneth Gragg, The call of the Minaret, New York 1956.) نصرانیوں پر اثر انداز ہونے کے اعتبار سے اسلام کی بہتر تشریح ہے۔ اسلام کی اس سے بہتر تشریح کرنے میں عہد حاضر کا کوئی مسلمان بھی ابھی تک کامیاب نہیں ہوا ہے۔ میں نے مارگن کی مرتبہ کتاب Islam – the Straight Path پر جو تبصرہ ۱۹۵۹ء کے جرنل آف دی امریکن اورنٹیل سوسائٹی میں شائع کرایا تھا وہ بھی ملاحظہ فرمایا جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سب باتوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کے قلوب میں جو دین ہے اس کے بارے میں منصفانہ طور پر جب ایک بار رائے قائم کر لی جائے تو پھر اس بیان کو متعلقہ لوگوں میں بھی حسنِ قبول حاصل ہونا چاہیئے۔ یہ ایک محنت طلب تخلیقی اور دعوتِ مقابلہ دینے والے کا کام ہے[1]

یہ خصوصی بحث پوری طرح تشفی بخش ہو یا نہ ہو، بہرحال ہم اب آگے بڑھتے ہیں۔ ایک عام مسئلہ پیش کیا گیا اور وہ یہ ہے کہ عہدِ حاضر کی دنیا کے نئے حالات میں مذہب کے تقابلی مطالعے نے ایک نئی شکل اختیار کر لی ہے۔ پہلے تو اس حیثیت سے کہ اب تحقیق کا موضوع انسانی برادریاں بن گیا ہے۔ اور بالکل ہی نئے پیمانے پر بنا ہے اس ارتقاء کے مضمرات کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ اس موضوع پر زور دینے کے لئے بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔

(۲)

ہمارا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ تحقیق کا موضوع بھی اب شخصی تعلق کا وصف اختیار کرتا جا رہا ہے۔ یعنی محقق کی حیثیت۔ سابق میں کوئی عالم بے تعلق علمی طریقے پر خاصے شاندار انداز میں اپنے مواد کی ساحت کرتا اور پھر معروضی انداز میں اس کو دوسروں تک پہونچاتا نظر آتا تھا۔ ایسا عالم مثالی سمجھا جاتا تھا۔ یہ تصور مغربی یورپ

---

[1] میری حالیہ تصنیف Islam in Modern History (Princeton, 1957) اس دعوتِ مقابلہ کا جواب دینے کی دانستہ اور واضح کوشش ہے۔ اس کا مقدمہ ملاحظہ ہو (ص ×—۲) اس کتاب کا وہ حصہ یہاں خاص طور پر متعلق ہے جہاں اسلام بحیثیت دین کے معنی کی تشریح پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (ص ص ۹-۲۶) یہ کتاب ارادتاً اس بات کی کوشش میں لکھی گئی ہے کہ وہ بیک وقت (۱) صحت پر مبنی ہو (اور علمی دلچسپی رکھنے والے طالب علموں کے لئے قابل فہم اور عالمانہ ہو) (۲) مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو اور (۳) نصرانیوں کے لئے قابل فہم ہو۔ اگر میں اپنی کوشش میں جزوی طور پر کامیاب رہا تو اس کے معنی ہوں گے کہ ایسی کوشش ہوتی رہنی چاہیئے، نہ کہ سرے سے کوئی کوشش ہی نہ کی جائے۔ ایسے ہی مسئلہ کی وضاحت کے لئے انگریزی دان کی جس تصنیف کا حوالہ حاشیہ نشان (۲۱) حاشیہ ۱ برہان صفحہ ۲۷۹ کے ذیل میں آیا ہے وہ ملاحظہ فرما لیا جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی علمی روایت کے ساتھ مخصوص ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ اضافہ کرنے کی جسارت کی جا سکتی ہے کہ یہ تصور خاص طور پر انیسویں صدی کے مغربی یورپ کے ساتھ مخصوص رہا ہے۔ ہمارا شعبہ ہو کہ دوسرے علمی شعبے، کوئی شخص اس روایت کی اہمیت کم کر سکتا ہے اور نہ اس کے کارناموں کی قدر گھٹا سکتا ہے بایں اب صورت حال تین حیثیتوں سے بہت پیچیدہ ہو گئی ہے۔

پہلے تو یہ کہ اس خاص شعبۂ علم میں منجملہ اور چیزوں کے محقق کی بے تعلقی کے معنیٰ یہ لئے گئے تھے کہ تحقیق کرنے والا عالم مذہب پر تو تحقیقی کام کرتا ہے لیکن (کم از کم نیم عالم) اس میں حصہ نہیں لے سکتا پہلی جنگ عظیم سے پہلے یا اس کے قریبی زمانے میں مطالعہ مذہب کے سلسلہ میں علمی نہج پر جو قابل لحاظ کام ہوا تھا اس کا بیشتر حصہ لادینی عقلیت پرست نے انجام دیا تھا۔ دوسری طرف مغرب میں بیسویں صدی کے وسط میں کوئی نصرانی غیر نصرانی مذاہب کا مطالعہ کرنے والے یا کم از کم تمام مذاہب کے محقق ہونے کی حیثیت سے عقلیت پرست کی جگہ نہ لے سکا۔ تاہم وہ اس کام میں شریک ضرور ہو گیا۔ آج سے پچہتر سال پہلے وسیع طور پر جامعات میں یہ اصول تسلیم کر لیا گیا تھا کہ نصرانیت اور دوسری ملتوں کے ادیان کا "غیر جانب دارانہ" یا سائنٹیفک مطالعہ کرنے والے کا ایک لازمی وصف یہ ہونا چاہیے کہ وہ خود اپنا کوئی مذہب رکھے اور نہ وہ کسی مذہب کا پابند ہو۔ موجودہ زمانے میں اس اصول کے برعکس خیال کو کچھ کم مقبولیت حاصل نہیں ہے[۵]

دیکھیے یہ کہ دوسرے علوم کے شعبوں کی طرح اس شعبہ میں بھی دوسری تہذیبوں کے حامل محقق بھی

---

[۵] جب یہ بات عام ہوئی کہ مذہب کے تقابلی مطالعہ کے ایک خاص شعبہ کی صدارت پر ایک ایسے پروفیسر صاحب فائز ہوئے ہیں جو تثلیث کے منکر نصرانی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں تو اس مقالہ نگار نے اپنے ہم کاروں میں اس کے متضاد ردعمل مشاہدہ کیے۔ اور ایک ردعمل تو یہ تھا کہ ان پروفیسر صاحب کے تثلیث کے منکر فرقے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے "کم از کم وہ اپنے اکابر میں (راسخ العقیدہ نصرانی کے مقابلہ میں) زیادہ متعصب نہ ہوں گے"۔ دوسرا ردعمل یہ رہا کہ جو شخص خود اپنے مسلک کی تہ تک نہ پہنچ سکا اس سے اس بات کی توقع ہی فضول ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے نقطۂ نظر کو سمجھ سکے گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مغربی عالموں کے دوش بدوش کام کرنے لگے ہیں۔ ایسا تعاون دنیا میں ہو رہا ہے جہاں دینی اور لادینی کی مغربی مساویانہ تقسیم رائج نہیں ہوئی یا پوری طرح رائج نہیں ہو سکی۔ عالم اسلام میں، ہندوستان میں بدھ مت کے ماننے والے ملکوں میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جائے گا اور توقع کرنی چاہئیے کہ بحیثیت مسلمان، بحیثیت ہندو اور بحیثیت بدھی لکھا جائے گا۔[۵] کم از کم اتنا تو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ مذہب سے بے تعلق رہ کر لادینی علمی انداز میں مذہب کا مطالعہ کرنے کی روایت کے ساتھ ساتھ نصرانی دنیا میں اور دوسری جگہ بھی مذہب سے وابستہ رہنے اور دینی تنوع رکھنے والی علمیت بڑھتی جا رہی ہے۔[۵۲]

---

۵ اشتمالی (کمیونسٹ) عالم جیسے مثال کے طور پر چین کے اشتمالی عالم لادینی انداز میں لکھیں گے لیکن بے تعلق ہو کر نہیں لکھیں گے۔ چونکہ میں اپنا شمار ان لوگوں میں کرتا ہوں جو دین کنفیوشس کے پیروؤں کو واقعتاً مذہبی سمجھتے ہیں اس لئے غیر اشتمالی چینی مصنفوں کا شمار اس عام اصول کی مستثنیات میں شاید ہی ہو سکے۔

۵۲ بہت سی حالیہ مثالوں میں سے ایک مثال: Franz Koning (ed), Christan und die Religionen der Erde.-(3 vol. Freiburg 1956). ایک اسلامی مثال الدین بحوث و ممهدات لدراسات تاریخ الادیان مصنفہ عبد اللہ دراز (قاہرہ ۱۹۵۲ء) ایک تازہ ترین مثال یہ ہے: مذاہب عالم مصنفہ عبد اللہ المسدوسی (کراچی ۱۹۵۸ء) عمومی طور پر اس سلسلہ کے قدیم ناموں میں میاکس ملر، فریزر، ڈاک ہائیم اور فرائیڈ ہیں۔ تازہ واردوں میں آٹو، کریمر، واچ، فان ڈرلیو، ایلیڈ وغیرہ کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مزید برآں اس بات پر بھی توجہ کی جا سکتی ہے کہ عصر حاضر میں لادینی مسلک پر چلنے والے دینی مسائل پر جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ کس قدر بے وقعت ہے اور ان کے بالمقابل مذاہب کے نو خیز شعبوں، دینی مدرسوں اور کلیساؤں کی سرگرمیاں خصوصاً امریکہ میں کتنی وسیع ہیں۔ ابھی اس بات پر بھی کچھ زیادہ دہائیاں نہیں گزری ہیں کہ فی الواقع معیار یہ سمجھا جاتا تھا کہ علمی انداز میں لکھنے والے مسلمہ طور پر مذہب کو ایک فریب سمجھتے تھے۔ یعنی یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو عام علمی اصطلاحوں میں نہیں بلکہ دوسری اصطلاحوں میں بھی سمجھایا جا سکتا ہو۔ اس بحث پر لکھی ہوئی حالیہ کتابیں مذہب کو ایک قبول کردہ پابندی نہیں مانتیں تو کم از کم ایک پراسرار چیز ضرور سمجھتی ہیں۔ فرداً فرداً ایک ایک مذہب پر بعض پادریوں (جیسے اسلام پر گراگ نے اور بدھ مت پر داؤبک نے) جو مطالعات پیش کئے ہیں، کسی بھی لادینی مصنف کا کام ان کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر یہ مطالعات ایک حد تک مذہبی لوگ ہی مذہبی لوگوں کے لئے جاری رکھیں گے

اس ارتقار کا تیسرا رُخ یہ ہے کہ لادینی عقل پرست بھی ایسا ہی دکھائی دینے لگا ہے جیسا کہ کوئی دو شخص ہوتا ہے۔ وہ کوئی دیوتا ہے اور نہ کوئی مافوق انسانی برتر سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص یا اپنی سرحدوں میں کوئی حاکم مطلق۔ یہ تو ایسا شخص ہے جو اپنا مخصوص نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ لادینی عقلیت سیدھا راستہ ہو۔ اور جیسا کہ خود اس کا ادعا ہے حقیقت پر مبنی ہو۔ لادینی عقل پرستی خود یہ محسوس کرنے لگی ہے کہ ابتدا ہی سے اس کو ایسا فرض کرنے کے لئے کوئی قاعدۂ کلیہ موجود ہے اور نہ وہ کوئی ایسی بدیہی چیز ہے کہ اس کی سند سے نتائج اخذ کئے جائیں، اس لئے اب وہ اپنے ہی ہم درجہ و ہم رتبہ روایات کے مقابلہ میں دوسروں کے متعلق فتوے صادر کرنے کے لئے دعوت مقابلہ قبول کئے بغیر اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ یہ روایات خواہ وہ نصرانی ہوں، ہندو ہوں یا کوئی اور بہر حال وہ خود بھی ایسا ہی (بلکہ اس سے زیادہ کا) دعویٰ کرتی ہیں جیسا کہ خود لادینی عقل پرستی نے کیا ہے۔ مغربی یورپ کی علمی حیثیت کے زوال وجود فلسفوں اور تصورات کے عروج، مغرب کی "مذہب کی طرف مراجعت" اشتمالیت کے عروج اور ایک دینی اساس پر مشرقی تہذیبوں کا دوبارہ اُبھرنا، غرض ان سب چیزوں کے اجتماع نے ایک نئی صورت حال پیدا کردی ہے۔ اس صورتِ حال میں لادینی دانشمند کو دین دار کی طرح انسانوں کے ایک گروہ کے ایک رکن کی حیثیت سے جگہ ملی ہے۔ لادینی دانشمندوں کا یہ گروہ دنیا کی مختلف برادریوں میں سے ایک ایسی برادری سے تعلق رکھتا ہے جو دوسری برادریوں پر نظریں دوڑا رہا ہے۔

اس واقعہ کو تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ ہر مصنف اپنی حد تک اپنی خصوصی روایت کا محافظ و ترجمان ہے خود مصنف بھی اپنی یہ حیثیت تسلیم کرنے لگا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ دوسرے لوگ اپنی اپنی خصوصی روایتوں کے محافظ و ترجمان ہیں[1]

---

[1] اسلامی مطالعات کے سلسلہ میں اس عمومی مسئلہ کی وضاحت مغرب کے دو قابل ترین عالموں کے ذریعہ کی جاسکتی ہے ان عالموں سے ہماری مراد ہے گب (Gibb) اور گرونے بام (Grunebaum) ہیں، اول الذکر موجودہ صورتِ حال میں "وہ" اور "ہم" کی اصطلاحوں میں سوچتے ہیں اور "ان" کے بارے میں رہاتی بر موآمندہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب دوسرا قدم نسبتاً تیزی سے اُٹھتا ہے۔ جب مصنف اور جو کچھ مصنف نے لکھا ہے، شخصی بن جاتے ہیں تو دونوں کے درمیان جو رشتہ ہے بھی ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں موجودہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ اپنی معلومات پیش کرتے ہیں۔ یہ بات اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ خود انھوں نے اپنی کتاب (Modern Trends in Islam (Chicago, 1947 کے مقدمہ میں یہی اصطلاحیں استعمال کی ہیں (ملاحظہ ہو ص ص x – xii) عالم کی حیثیت سے گب کی عظمت مسلم ہے۔ وہ اس امر سے اچھی طرح آگاہ ہیں اور اس کو مغربی علمی روایت میں شامل کرتے ہیں کہ اسلام زندہ انسانوں کا مذہب ہے۔ اُن کی عالمانہ عظمت کا ایک سبب یہی آگہی ہے۔ وہ اس میدان میں کام کرنے والے پہلے عالموں میں تھے جو باقاعدہ اسلامی دنیا میں آیا جایا کرتے تھے (پہلی عالمی جنگ تک وہ ہر سرما میں کافی وقت قاہرہ میں بسر کرتے رہے اور مصری اکیڈیمی کے رکن بھی تھے۔ ماسینو کے متعلق بھی یہی بات درست ہے، ماسینو مغربی اسلامیات میں شخصی احساس داخل کرنے والے اولین پیش رووں میں گنے جاتے ہیں) گب نے جہاں "ہم" کہا ہے، وہاں اس سے ان کی مراد مغرب کی نصرانی ملت ہے۔ گرونے بام نے اسلامی تمدن کا مطالعہ ایسی مغربی علمی روایت ("ہم") کے ایک باشعور نمائندے کی حیثیت سے کیا ہے جو اسلامی روایت ("وہ") کے بالمقابل موجود ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ عہدِ حاضر کی دنیا میں اول الذکر روایت کی حیثیت دفاعی ہے۔ مغربی روایات کی ان کی نظر میں وقعت رہی اور اسی کے وہ پابند رہے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ صاف طور پر اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ دوسری روایتیں بھی وقیع ہیں اور دوسرے لوگ بھی اس سے وابستہ ہیں۔ یہ دونوں روایتیں قابلِ مقابلہ و موازنہ بھی ہیں لیکن ایسے مقابلہ کو وہ زیادہ معقول نہیں سمجھتے۔ فی الاصل ان کے پیشِ نظر مذہب کے تقابلی مطالعہ کی بہ نسبت تمدن کا تقابلی مطالعہ رہا۔ اس حیثیت سے مغرب کی علمی روایت، مغربی تمدن کا بلند و بیش بہا پہلو اور اسلام اور اسلامی تمدن کا اساسی رُخ ہے۔ ان کے اس نقطۂ نظر سے ہماری بحث کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتی۔ اسلام پر لکھی ہوئی ان کی بیشتر تحریروں میں "ہم - وہ" کی یہی لے ملتی ہے۔ اُن کی یہ لے غالباً سب سے زیادہ اس مقالے میں نمایاں ہوئی ہے۔ انھوں نے مشرق قریب کی تاریخ پر اسکول آف اورینٹل اینڈ آفریکن اسٹڈیز جامعۂ لندن میں (۱۹۵۸ء) سنایا تھا۔ یہ مقالہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صورت حال ایک دعوتِ مقابلہ ہے[1] جب اشخاص یا انسانی برادریاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو ایک کو دوسرے تک اپنے خیالات پہونچانے کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح جو چیز اب تک بیان کی حیثیت رکھتی تھی، وہ مکالمہ کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔

لوگوں سے متعلق کچھ کہنا اور لوگوں سے مخاطبت ایک ہی چیز نہیں اور نہ اُن سے گفتگو کرنا ایک جیسی بات ہے۔ یہ تینوں باتیں مختلف ہیں۔ مذاہب کے تقابلی مطالعے میں ان آخرالذکر دو مرحلوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ یہ بات جامعات میں شاید تدریجی طور پر مگر کلیسا میں فوری طور پر محسوس ہو رہی ہے۔ حالیہ

---

[1] ملاحظہ ہو C.A.O. Van Nieuwenhuyze "Frictions between: Presupposition in Cross Cultured Encounters: The Case of Islamology" (Institute of Social Studies Publications on Social Change No 12 The Hague, 1958), P.P. 66-7

ہمیں اپنے اسلامی مطالعات کے متعلق یہ سمجھنا چاہئے کہ تشریح و تعبیر تو رہی ایک طرف ان کی حیثیت افہام و تفہیم کی کوشش سے کہیں زیادہ ایک دعوتِ مقابلہ ہے" یہ اقتباس سنہ ۱۹۵۵ء کے اس بین الاقوامی اسلامی مجلس مباحثہ میں عمومی تبصرے کے طور پر لکھے ہوئے ایک مقالہ سے لیا گیا ہے جو لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ اس مجلس مباحثہ میں میں نے بھی شرکت کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس موتمر کا بے ڈھنگا ارتقار خود ایک حد تک بلا تاخیر اسی انداز میں تجزیہ کی دعوت دیتا ہے جس انداز و اسلوب میں یہ مقالہ پیش کیا گیا ہے۔ اس موتمر میں مسلمانوں (اور "غیر مسلموں") نے اسلام پر بحث میں حصہ لیا۔ دوران بحث میں باہمی تعلقات کی ہر نوعیت کی نمائندگی کا اظہار ہوا جس میں غیر شخصی "وہ" (بے جان) غیر شخصی "وہ" (جاندار)، "ہم / وہ" "ہم / تم" "ہم سب" جیسے تعلقات کی نوعیت نمایاں ہوئی۔ یہ موتمر اس لئے ناکام ہوگئی کہ وہ ان تعلقات کی وضاحت ہی کر سکی اور نہ اس کو صاف کر سکی کہ تعلقات کی کونسی نوعیت عام ہونی چاہیئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سالوں میں رومی کلیسا اور پروٹسٹنٹ کلیسا[1]۔ دونوں میں واقعتاً لفظ "مکالمہ" کثرت سے استعمال کیا جانے لگا ہے[2] اسی سلسلہ میں بڑی بڑی تحریکیں چل رہی ہیں۔ غالباً ابھی یہ کہنا بہت قبل از وقت ہوگا کہ

---

[1] دنیا بھر میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ میرے ایک فلسطینی دوست کا قول ہے کہ "آج کل مکالمہ اور دعوت مقابلہ کے تصورات سے فضا معمور دکھائی دیتی ہے" اس کی عملی مثال جو اصلاً اسلام سے متعلق ہے یہ ہے ۱۹۵۶ء میں مراکو کے شہر Tioumbline میں بین الاقوامی مجالس مباحثہ کی گرمائی میقاتین اس نظریئے کے بارے میں علمی حیثیت کے بیان کی مثال لوئی گارد ے اور م۔م انواتی کی کتاب ہے۔ اس کا عنوان ہے "اسلامی دینیات کا مقدمہ۔ تقابلی دینیات (پیرس ۱۹۴۸ء)":-

Introduction à la Theoloie Musulmane: Essai de Theoologie Comparee (Paris 1948)

عقائد کے سلسلہ میں ان کا یہ اعلان قابل لحاظ ہے:- "یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب (تعمیری یا غیر تعمیری) اور عربی اسلامی تہذیب کے درمیان باہمی مکالمہ کی نوبت ابھی بہت کم آئی ہے لیکن اب اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے" اور پھر اس کتاب کے آخر میں لفظ "مکالمہ" کا استعمال ملاحظہ ہو۔ یہاں یہ لفظ جس آخری عبارت میں آیا ہے وہ غالباً پوری کتاب کا نقطۂ عروج ہے -

[2] دنیا بھر میں اس کی بھی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ لفظ "مکالمہ" (اسی طرح "دعوت مقابلہ" بھی) جنیوا کی کلیساؤں کی عالمی کونسل اور مبشرین مسیحیت کی بین الاقوامی کونسل میں مقبول ہو گیا ہے۔ اس طرح کم رسمی یا کم متعدد حلقے بھی یہ لفظ استعمال کرنے لگے ہیں واقعہ یہ ہے کہ یہ اصطلاحیں بعض نصرانی افکار میں اتنی عام ہو گئی ہیں کہ ایک تازہ علمی کتاب میں اس اسم کو فعل کی صورت میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو "ہم نصرانیوں" (ضمیر قابل لحاظ ہے) کے لئے یہ بات مفید ہوگی کہ دین مسیحیت کی مقدس کتابوں پر دوسرے تبلیغی مذاہب رد و قدح کرتے رہیں.... موجودہ رد و قدح مذاہب کے متنازع فیہ مسائل اور ان کے درمیان جو اختلافات ہیں ان کو واضح طور پر باہر نکال لاتے ہیں اور اس طرح ایک حقیقی نصرانی، حقیقی یہودی، سچے مسلمان، بہترین ہندو دوسروں سے مکالمہ کر سکتا ہے۔ *The gospel in Dispute, New york 1958)* انگریزی زبان میں *dialogue* بطور فعل استعمال نہیں ہوتا۔ وسی لئے مقالہ نگار نے اس لفظ کو بطور فعل استعمال ہونے کا شاہ نقل کیا ہے۔ (مترجمین) اس کتاب کے مصنف اڈمنڈ پیری جامعہ نارتھ ویسٹرن کے شعبہ تاریخ و ادبیات و مذاہب کے صدر نشین ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آیا یہ انجیلی عقائد کی تبلیغ کی ابتدائی یک طرفہ دعوتی تحریک کی وہی شکل ہے جو اب نئی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ محرکات اس سمت میں کام کر رہے ہیں۔ ان محرکات میں ان مذاہب کی جانداری تو بہرحال کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتی جنھیں مخاطب کیا جا رہا ہے۔ کیا تبلیغی جماعتوں کے لئے کوئی دوسرا ممکنہ قدم یہ نہ ہوگا کہ لازمی طور پر وہ دوسرے مذہبی گروہ سے یہ کہیں کہ "حق کے تعلق سے جو کچھ ہم نے دیکھا ہے وہ یہ ہے۔ ہمارے لئے خدا نے جو کچھ کیا ہے وہ یہ ہے۔ کہئے آپ نے کیا دیکھا ہے۔ خدا نے آپ کے لئے کیا کیا ہے آیئے آپ ہم مل کر اس پر بحث کریں گے۔"[1] اگر یہ دعوت مخلصانہ ہے تو ہر طرح جائز معلوم ہوتی ہے، ہاں، اس کے ساتھ ساتھ اس بحث میں حصہ لینے والا اپنے دل میں اس بات کا متوقع رہے یا یقین رکھے کہ کھلے دل کے ساتھ بحث و مباحثہ کے نتیجہ کے طور پر فریق ثانی اس کی طرف مائل ہو جائے گا تو اس صورت میں مباحثہ کی نوعیت تبلیغی ہی ہوگی، شاید بعض کلیسائی واجبات انجام دیتے ہوئے اس قسم کی بھائی چارگی کے زیادہ سے زیادہ آزادانہ مکالمے یا مقابلے منعقد کئے جا سکتے ہیں۔ ان مکالموں یا مقابلوں کی روح ترغیبی و تحریصی نہیں بلکہ متجسسانہ و محققانہ ہوگی۔ ان میں دو مختلف ذہنوں یا گروہوں کے ارکان کچھ حاصل کرنے کے لئے حصہ لیں گے۔ پہلے کی طرح یہاں بھی وہی سوال دہرایا جائے گا۔ لیکن یہاں سوال کرنے والے کا مقصد دوسرے گروہ کو فائدہ پہونچانے سے زیادہ خود اپنا استفادہ ہوگا یا پھر وابستگی کا رخ کسی اور طرف پھیرے بغیر مقصود سب کا مشترکہ استفادہ ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض اداروں کی طرف سے اس طرح کے ابتدائی مقابلوں کی دعوتیں دی جا رہی ہیں۔ ان کا واضح مقصد یہ ہے کہ مختلف انسانی گروہ ایک دوسرے کا احترام کرنے اور ایک دوسرے کی رفاقت میں زندگی بسر کرنے کا گر سیکھ جائیں۔ یہ مقصد خواہ کتنا ہی

---

[1] بعض صورتوں میں محاوروں اور انداز بیان کو بدلنے کی ضرورت ہوگی جیسے تھیراوادن بدھیوں (Theravadin Buddhists) کا معاملہ ہے۔ لیکن اس سے پیش کشی کے طریقے کی اہمیت نہیں بدلتی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضروری کیوں نہ ہو مشکل الحصول ہے[1]

مذہب کا تقابلی مطالعہ کرنے والے کو اس قسم کے حالات کا مقابلہ مختلف طریقوں سے کرنا پڑے گا اور مجھے تو یہ بات عجیب ہی معلوم ہوتی ہے کہ مذہب کا تقابلی مطالعہ کرنے والا ان کا سرے سے مقابلہ ہی نہ کرے۔ پہلے تو وہ کسی نہ کسی گروہ کے ایک رکن کی حیثیت سے مکالمہ میں حصّہ لے گا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ نصرانیوں اور بدھیوں کے اجتماع میں گفتگو بہتر طور پر آگے بڑھے گی بشرطیکہ بدھیوں کی جماعت میں مذہب کے تقابلی مطالعہ کا ایک فن داں طالب علم بھی شامل ہو۔ ڈاکٹر رادھاکرشنن کو ایسے کسی مکالمہ میں مدعو کئے بغیر ہندوؤں کے ساتھ مکالمہ منعقد کرنے کی تجویز قابل غور ہی معلوم نہ ہوگی۔ اس میں شبہ نہیں کہ دعوت مقابلہ میں حصّہ لینے والے تمام ارکان سے توقع کی جائے گی کہ عملاً وہ خود بھی کسی نہ کسی طرح مذہب کا تقابلی مطالعہ کرنے والوں کی حیثیت اختیار کرلیں گے۔ توقع ہے کہ ایسے ماہرین ایسے کام کا آغاز اسی طرح کریں گے۔ بعضوں کو یہ محسوس ہوگا کہ مذہب کے تقابلی مطالعہ کا ماہر اپنے مذہب کے حامی کی حیثیت سے کسی دعوت مقابلہ میں بالکل بے محل ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں اس کی مبلغانہ حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ خاص طور پر نصرانیوں کی صورت میں اور ایک حد تک نظری حیثیت سے اس کا اطلاق مسلمانوں پر بھی ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آج کل علانیہ اس پر

---

[1] دوستانہ طور پر مذاہب کے ایک دوسرے کے قریب آنے کی مثالیں یہ ہیں:۔ "مذاہب کی عالمی کانفرنس جس کی بنیاد سنہ ۱۹۳۶ء میں بمقام لندن سرفرانسس ینگ ہزبینڈ نے رکھی۔ اب اس کے ارکان بہت ہیں۔ اس کانفرنس کا ایک لائحۂ عمل ہے اور اُس نے ایک ادارہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے علمی سطح پر اس کی مثال بمقام آکسفورڈ ۱۹۵۰ء میں اسپالڈنگ، رادھاکرشنن اور ریون وغیرہ کا مل کر "بڑے مذاہب کی یونین" کا قائم کرنا ہے۔ خاص طور پر دو مذہبوں کے درمیان ایسے تعاون کی مثالیں یہ ہیں:۔ نصرانیوں اور یہودیوں کی کونسل جو ۱۹۲۳ء میں قائم کی گئی۔ اسی طرح "اسلامی نصرانی تعاون کی استمراری کمیٹی (Continuing Committee on Muslim Christian Cooperation) یہ کمیٹی ۱۹۵۴ء میں قائم کی گئی "مشرق وسطیٰ کے دوستوں" کے زیر اہتمام اس کمیٹی کے اجلاس بانڈون اور لبنان میں ہو چکے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عمل پیرا نہ ہو سکے۔ یہ احساس دو وجوہ کی بنا پر پیدا ہوتا ہے، ایک وجہ تو بے تعلقی کی وہ مغربی علمی روایت ہے جس پر ہم تبصرہ کر آئے ہیں۔ دوسری وجہ صرف مخصوص لوگوں سے ربط و ضبط پیدا کرنے کا رجحان اور تبلیغ کی نصرانی روایت ہے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ یہ آخری دو عناصر دین نصرانیت کے لازمی عناصر ہیں اور نہ لازمی عناصر بن سکتے ہیں اور میرا شخصی نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ دوسرے ادیان سے نصرانی مکالمہ کا اصل فائدہ اور مقصد، کم از کم ان معنیٰ میں نصرانی تعلیم ہی ہوگا کہ یہ مکالمہ خود اپنے مذہب کو پوری طرح سمجھے اس کے ساتھ وفادار رہتے (اور غالباً صحیح معنیٰ میں وفادار رہنے) میں لوگوں کی مدد کرے گا اور اسی کے ساتھ بالآخر یہی مکالمہ دوسروں کے بہتر صفات کو سراہنے اور (خدا کی نظر میں) دوسروں کے وجود کو حق بجانب سمجھنے میں مدد دیگا۔ آج بہت سے حضرات یہ کہیں گے کہ اصولاً یہ ناممکن ہے۔ میں یہ یقین کرنے کی جسارت کروں گا کہ یہ ممکن ہے[۵] اور دین عیسوی کے پیروؤں کے لئے اس یقین تک پہنچنے کے لئے ایسا مکالمہ ایک ذریعہ بن سکتا ہے۔

کسی کے ذاتی خیالات چاہے کچھ ہی ہوں، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ کس طرح میں یا کوئی اور علمی یا اخلاقی بنیادوں پر یہ قانون بنا سکتا ہے کہ مثال کے طور پر ہینڈرک کریمر کو دوسرے مذاہب کے ساتھ نصرانی دعوت مقابلہ میں حصہ لینے کی اجازت نہ دے یا انہیں اپنی کرسی صدارت پر فائز ہونے کے حق سے محروم رکھے[۶]۔ میں ان کے خیالات کو قطعاً پسند نہیں کرتا لیکن میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ان

---

[۵] اول یہ کہ میں اس نقطۂ نظر ہی کو صحیح نہیں سمجھتا کہ پہلے ہی سے یہ اصول بنا لیا جائے کہ مذہب کے تقابلی مطالعے کا بہتر عالم بننے میں کسی شخص کو اپنی دینی برادری سے علیحدہ ہونا لازمی ہو۔ میرا یقین ہے کہ کوئی شخص دوسری برادری کے دین کو اس وقت تک پوری طرح سمجھ نہیں سکتا جب تک کہ اسے یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ دین خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ربط کا کام دے سکتا ہے، کام دیتا ہے، کام دے چکا ہے۔

[۶] ہینڈرک کریمر نے جب اپنی کتاب "ایک غیر نصرانی دنیا میں نصرانی پیام" (Hendrik Kraemer: The Christian Message in a Non Christian World, London 1938) لکھی ہو، اس وقت وہ جامعہ لیدن میں تاریخ ادیان عالم کے پروفیسر تھے۔ شاید ہی کوئی یہ کہہ سکے کہ وہ اس منصب پر فائز ہونے کے اہل نہ تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خیالات کو دبانے کی جگہ مجھے ان کی تردید کرنی چاہیے۔[1]

دوسری قسم کے مکالمہ میں جس کا مقصد آپس میں ایک دوسرے کی تفہیم اور باہمی دوستی و رفاقت

۱؎ یہ ہر طور کریمر کے اخذ کردہ نتائج پر صرف بحث کرنا ہی نہیں بلکہ اس کو اپنے عہدہ کے لئے نااہل قرار دینے کے لئے اس عام اصول پر زور دینا بھی جائز ہے کہ کوئی غیر شخص کسی تمدن یا کسی بڑے دین کو سمجھ ہی نہیں سکتا تاوقتیکہ انکسار و اخلاص اور محبت و تواضع سے اس کا مطالعہ نہ کرے۔ مجھے یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ اس اصول کا اطلاق نسطائیت جیسی عجیب و غریب تحریک پر نہیں ہوتا۔ مجھے ذاتی طور پر کم از کم بڑے مذاہب (جو اپنے پیچھے انسانی ترقیوں کا طویل تاریخی کارنامہ رکھتے ہیں) اور نسطائیت جیسی تحریک میں بڑا ہی بنیادی فرق نظر آتا ہے اور اس سلسلہ میں مجھے کوئی عملی مسئلہ دکھائی نہیں دیتا۔ جہاں تک متن میں اس جملہ کا تعلق ہے اس کی حیثیت شاید ایک علمی (ذہنی) مسئلہ سے زیادہ نہیں۔ جب تک یہ علمی مسئلہ حل نہ ہو جائے، اوپر حاشیہ نشان (۲۷، حاشیہ برہان ۱ ص ۲۷۹) میں میں نے جو بات بیان کی تھی ذہنی سطح پر مزید وضاحت چاہتی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی مذہب کے متعلق اس مذہب کے نہ ماننے والے کی موزوں تحریر کے تعلق سے خیالی طور پر یہ تسلیم کرنے کی ضرورت ہے کہ مثلاً اگر میں ہندو یا مسلمان کی حیثیت سے پیدا ہوتا تو قیاس یہ ہے کہ میں ہندو یا مسلمان ہی رہتا لیکن اگر میں جرمن گھرانے میں پیدا ہوتا تو میں خیال کرتا ہوں کہ میں نازی نہ ہوتا۔ کیا اس فیصلہ کو معقولیت بخشی جا سکتی ہے اور کیا اسے معروضی طور پر درست تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ یہ ایک معروضی بیان ہے اور اس کا تشفی بخش ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔ جرمنوں کی ایک بڑی تعداد نے نازی ازم کو قبول نہیں کیا تھا۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان تمام جرمنوں کی مدح و ستائش کی جاتی ہے جنھوں نے نازیت کو رد کر دیا تھا اور ایسے جرمنوں سے دوستی کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح جن ہندوؤں اور مسلمانوں کی میں مدح و ستائش کرتا ہوں اور جو میرے دوست ہیں (نصرانیوں کو چاہیے کہ عام طور پر انہیں پسند کریں اور انہیں دوست بنائیں) وہ ہندو اور مسلمان ہی رہتے ہیں اور غالباً یہ بہتر ہے کہ وہ ایسے ہی رہیں۔

میرے بیان بالا میں یہ بات شامل ہونے سے رہ جائے کہ اگر میں ہندو یا مسلمان ہوتا تو غالباً اصلاح پسند ہندو یا مسلمان ہوتا (بالکل اسی طرح جیسے کہ واقعتاً میں اصلاح پسند نصرانی ہوں)۔ چونکہ ہر دین کا تعلق حقیقت مطلق سے ہوتا ہے اس لئے مذہب کی حقانیت کا ایک جزیہ ہے کہ وہ اس کی موجودہ صورتوں سے غیر مطمئن رہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو، مذہب کے تقابلی مطالعہ کا ماہر واضح طور پر حصہ لے سکتا ہے اس سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ اس علم کا کوئی نصرانی یا مسلمان عالم حال میں قائم شدہ "مسیحی اسلامی تعاون کی کمیٹی" یا ایک نصرانی یا یہودی عالم" نصرانیوں یا یہودیوں کی کونسل" میں بے محل سمجھا جائے۔ اگر وہ بے محل ہوگا بھی تو اپنی خانگی حیثیت سے ہوگا۔ لیکن یہ قیاس کرنا درست ہوگا کہ اس طرح کی مجلسوں میں شرکت سے وہ کچھ نہ کچھ ضرور سیکھے گا اور بحیثیت عالم ان کو کچھ نہ کچھ ضرور دے گا۔

ہمارے مطالعات کا نمائندہ ایک اور حیثیت سے بھی اپنی خدمت انجام دے سکتا ہے۔ یہ خدمت مختلف مذاہب کے درمیان دعوتِ مقابلہ میں حَکَم یا صدرنشین کی ہے۔ اپنے نقطۂ نظر کی وجہ سے کر کم اس کے لئے ناموزوں ہو سکتے ہیں اور وہ خود بھی ایسا منصب قبول نہ کریں گے۔ تاہم ہم میں سے بعض شاید اپنے آپ کو اس کے لئے موزوں سمجھیں اور شاید اس موزونیت کو اپنے کام کا جزو لازم قرار دے لیں۔ تربیت کا ایک مقصد یہ قرار دیا جانا چاہیئے کہ طالب علم کو کم از کم دو مذاہب اور اُن کے باطنی رشتے کے مسائل کو سمجھنے کے لئے تیار کیا جائے اور مذاہب کے درمیان وہ واسطے یا ترجمان کی خدمت انجام دے سکے یا کم کم اس کی حیثیت ایک طرح کے دلال کی ہو جو اُن کے درمیان افہام وتفہیم میں مدد دے سکے۔ آج اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ لوگوں کو اس طرح کے صفات سے آراستہ کیا جائے انہیں اس کی تربیت آخر کہاں ملے گی؟ جو تعلیم و تربیت انھوں نے حاصل کی ہے اس کے درجہ و مرتبہ کی آزمائش کے لئے اس سے بہتر اور کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔؟

واقعہ یہ ہے کہ آگے چل کر مذہب کے تقابلی مطالعہ کے عالم کو بطور پیشہ یہی خدمات انجام دینی پڑیں گی۔ بلکہ اس غرض کے لئے شاید مذہب کے تقابلی مطالعہ کا شعبہ ہی ایک ادارہ کی حیثیت اختیار کر لے۔ یہ بات کچھ بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ آنے والے مثلاً بیس پچیس سالوں کے درمیان میں دنیا کے مختلف حصوں میں مذہب کے تقابلی مطالعے کے شعبے ایسے مقامات پر باقاعدہ طور پر قائم ہو جائیں گے جہاں ایسے مکالمے واضح طور پر اور بالقصد والارادہ منعقد کئے جائیں گے اور مختلف روایتوں کی نمائندگی کرنے والوں کے درمیان ذہنی دعوتِ مقابلہ کے اصول وضوابط وضع کئے جائیں گے۔ شمالی امریکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی حد تک میک گل، شکاگو اور ہارورڈ کی جامعات میں یہ عمل شروع ہو گیا ہے۔ یہ تحریک اسی وقت موثر انداز میں چلائی جا سکتی ہے جب کہ ایشیا میں بھی اسی قسم کے ادارے موجود ہوں[1]

مذہب کا تقابلی مطالعہ کرنے والے عالم کی تیسری حیثیت مشاہد کی ہے۔ اگر مذہب کا تقابلی مطالعہ کرنے والا مکالموں میں، جو اب واقعتاً کثرت سے منعقد ہو رہے ہیں، حصہ لینا یا اُن میں توازن و اعتدال پیدا کرنا پسند نہ کرے تو کم از کم پیشہ کے لحاظ سے اس کے گرد و پیش میں جو کچھ ہو رہا ہے اس میں اس کو دلچسپی لینی ہی پڑے گی۔ یہ ادیان و مذاہب کی عصری تاریخ کا ایک جز ہے۔ ایک لحاظ سے اس کا شمار دین داری کی پوری تاریخ کے اہم ترین امور میں ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ادیان ایک دوسرے کو باقاعدہ اور ساتھ ہی ساتھ غیر رسمی طور پر دنیا کے قہوہ خانوں میں دعوتِ مقابلہ دے رہے ہیں۔ وہ لوگ جو عملاً اس دعوتِ مقابلہ سے دوچار ہیں، مذہب کا تقابلی مطالعہ کرنے والے سے ضمنی طور پر ہی سہی کوئی نہ کوئی نظریہ پیش کرنے کا مطالبہ کریں گے۔ جو لوگ مذہبی سرحدوں کے آس پاس ایک دوسرے سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں وہ محسوس کر رہے ہیں کہ ایک دوسرے کے مذاہب کے بارے میں ان کے تصورات ناکافی ہیں اور یہ کہ فریقِ مقابل جن اصطلاحوں میں بات سمجھ سکتا ہے، ان اصطلاحوں میں اُسے اپنے مذہب کی تفہیم کی اپنے میں مناسب صلاحیت نہیں پاتا۔ باہمی گفتگو کے لئے اُن کے یہاں جو مشترک تصورات ہیں وہ بھی ناکافی ہیں۔ یہ سب چیزیں حاصل کرنے کے لئے وہ مذہب کے تقابلی مطالعہ سے رجوع کرتے ہیں

اس سے اور ہٹی ہوئی سطح پر مذہب کے تقابلی مطالعے کے عالم کو ایک اور کام کرنا پڑے گا۔ یہ کام ہو گا کارزارِ مجری کی عمل کے کلیات کا تصور و ادراک اور جو کچھ اس سے حاصل ہونئے سرے سے اس

---

[1] مجموعی حیثیت سے دیکھئے تو ایشیائی مذاہب اور ایشیائی مذہبی برادریاں اشتراکِ عمل اور ایک دوسرے کے مطالعہ کے سلسلہ میں مغرب سے زیادہ آمادہ و تیار رہی ہیں۔ لیکن یہاں باقاعدہ اور علمی سطح پر اشتراکِ عمل اور ایک دوسرے کا مطالعہ زیرِ بحث ہے "بڑے مذاہب کے مطالعے کی بزم" (The Union for the Study of great Religions) (ملاحظہ ہو حاشیہ نشان (۳۵) حاشیہ ۲۵ برہان مئی ۶۴ء) اس معاملہ میں سرگرم عمل ہے۔ خاص طور پر پاکستان اور ہندوستان میں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے تصور کا۔

اس انسانی صورتِ حال میں میری اس حجت کی وضاحت ہوگی جو میں پہلے پیش کر چکا ہوں۔ یعنی مذہب سے متعلق کسی بیان کے صحیح و صادق ہونے کے لئے یہ امر لازمی ہے کہ جس مذہب کے بارے میں اس مذہب کا نہ ماننے والا جو بات کہے وہ بات خود اس مذہب کے ماننے والے لئے قابل فہم و قابل قبول ہو۔ اپنی کوشش میں مخلص ہونے اور اس کو دوسروں کے لئے مفید بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جو شخص اپنے مذہب کے بارے میں جو بات بیان کرے اس مذہب کے نہ ماننے والے کے لئے بھی وہ بات قابل فہم و قابل قبول ہو۔ جب مسلمان اور بدھی آپس میں ملتے ہیں تو جس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی ایسی تشریح ہو جسے مسلمان صحیح تسلیم کریں اور جو بدھی کو با معنیٰ معلوم ہو۔ ایسے ہی بدھ مت کی ایسی وضاحت ہونی چاہیئے جسے بدھی درست تسلیم کریں اور اسے مسلمان سمجھ لیں۔ اگر مقصود آپس میں ربط ضبط اور افہام و تفہیم ہو تو ایسے مکالموں میں حصہ لینے والوں کو اس کے صدر نشین کو اور جو کتابیں یہ لوگ پڑھیں گے ان کے مصنفوں کو اسی سمت میں گام زن ہونا پڑے گا۔

اس بات میں عمومیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے مطالعات کے ایک بنیادی مقصد کی بجا آوری کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ میں اسے کلیہ کی صورت میں اس طرح پیش کر رہا ہوں: مذہب کے تقابلی مطالعہ کا یہ فرض ہے کہ وہ مذہب کے بارے میں ایسے بیانات تیار کرے جو بیک وقت کم از کم دو روایتوں کے لئے قابل فہم ہوں[1] یہ کچھ آسان کام نہیں لیکن ذہنی

[1] ذیل کے اقتباسات جامعۂ میک گل کے شعبۂ اسلامیہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے قواعد ضوابط سے لئے گئے ہیں۔ اس صورت میں صرف ایک ہی مذہب کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور اسلامی روایت اور مغربی علمی روایت کے مشترک رشتے پر توجہ مرکوز رہی ہے۔ اس جامعہ کے شعبۂ اسلامیات نے ایک یادداشت تیار کی ہے۔ اس شعبہ سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے کے لئے اسلامی روایت پر مغربی علمی روایت کے انطباق کو ناکافی بتاتے ہوئے اس میں کہا گیا ہے کہ "شعبۂ اسلامیات کی غایت یہ ہوگی کہ وہ مغربی اور اسلامی دونوں روایتوں کے جوہر اور دونوں کی ہیئت کا کچھ نہ کچھ حصہ ایک دوسرے میں مدغم کرنے کی سعی کرے (باقی آئندہ صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حیثیت سے یہ کام اہم ہے اور تاریخی لحاظ سے اشد ضروری - (باقی)

حاشیہ صفحہ گذشتہ - جہاں تک ہیئت و شکل کا تعلق ہے ضروری ہے کہ طالب علم صرف ڈاکٹریٹ کے معنوی اصولوں کا پابند نہ رہے بلکہ ایسی تصنیف پیش کرے جو اسلامی روایت کے تسلسل کو قائم و برقرار رکھے۔ اس شعبہ کا فرض ہوگا کہ وہ ایسی نئی ہیئتیں تعبیر کرنے کی سعی کرے جو کسی قاعدہ قانون کے تحت لائی جائیں اور انہیں باضابطہ بنایا جائے۔ لیکن یہ بہر صورت دونوں طرف کی موجودہ شکلوں سے بہتر ہوں گی۔ ان نئی ہیئتوں کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ تو مغربی علمی روایت سے دست کش ہوں گی اور نہ اسلامی روایت کو مسخ کریں گی تحقیق کا حاصل دونوں روایتوں سے مربوط رہے گا تحقیق کا یہ حاصل ایسا ہو کہ دونوں روایتوں کے لحاظ سے وقیع و معنی خیز رہے اور دونوں روایتوں میں معقول و دل نشین سمجھا جائے دونوں روایتوں کی رو سے ڈاکٹریٹ کے مقالے کا ایک تعمیری اقدام تسلیم کیا جانا ضروری ہوگا" مذہب کے تقابلی مطالعہ میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے کے لئے ابھی تک ایسے قواعد و ضوابط پر عمل نہیں ہوا جو اس نقطۂ نظر کے مطابق ہوں۔ ان اصولوں کے ساتھ ایک اور شرط بھی عائد کی جانی چاہیئے۔ یہ نئی شرط یہ ہوگی کہ امیدوار کو تین روایتوں کی پابندی کرنی ہوگی۔ یعنی اسے مغربی علمیت اور کم از کم دو مذاہب کی روایتوں کا پابند رہنا ہوگا۔ زندہ مذاہب کی صورت میں ڈاکٹریٹ کے لئے کوئی مقالہ اسی وقت قابل قبول ہوگا جب کہ منجملہ دوسرے لوازم کے وہ ان تینوں روایتوں کے نمائندہ ممتحنوں کے نزدیک تشفی بخش قرار پائے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے سیاسی مکتوبات

اس کتاب میں پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی ایم اے نے حضرت شاہ صاحب کے نہایت اہم سیاسی خطوط جمع کئے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے اپنے زمانہ کی سیاسی حالت کا تجزیہ اور مطالعہ کس قدر گہری نظر سے کیا ہے۔ قیمت ۳/۵۰

صحیفۂ ہمام بن منبہ

مرتبہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب جس کو حضرت ابوہریرۃ رضؓ کے شاگرد ہمام بن منبہ نے پہلی صدی ہجری میں حضرت ابوہریرۃ سے روایت کر کے جمع کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے صحیفہ کی ترتیب قلمی مخطوطوں سے مقابلہ کر کے کی ہے
قیمت تین روپے آٹھ آنے

مکتبہ برہان اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی ۶

© rasailojaraid.com